بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

مسلم ہونے اور تحریکِ اسلامی کا علمبردار اور دعوتِ حق کا گواہ بننے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہی آدمی خدائے واحد کے سوا سارے آلہہ و طواغیت کا انکار کردے۔ سب سے مشکل کام نفس کے الٰہ کا انکار ہے۔ پھر بیوی بچوں اور خاندان کے الٰہوں کا انکار ہے۔ پھر ماحول کی رسمیات کے پورے مذہبِ اسراف و بدعت سے انکار ہے۔ جو شخص راہِ حق میں خلوص و صدقِ دلی سے نکلے اُس کے لیے راستہ یہی ہے کہ وہ مختلف الٰہوں کی لازم کردہ شریعتِ رسوم سے بغاوت کے لیے تیار ہو، ورنہ جسے ہر طرف بنا کے رکھنی ہو، اس کے لیے دین کی سربلندی کا کام کرنے والوں میں آگھسنا بعد میں خود اُسے پریشان کرے گا۔

چنانچہ سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کا آغاز ہی اصلاحِ رسوم اور انسدادِ بدعات سے کیا تھا۔ اسی طرح مولینا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس میدان میں بڑا کام کیا۔ آج بھی جس کسی کو دین کی خدمت کرنی ہے، اُسے رسوم و بدعات کی زنجیریں توڑنی ہوں گی اور اس کام کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

ہم پہلے ہمارے دورِ بادشاہت نے باہر کے اثرات لا کے ڈالے۔ پھر ہندوانہ رسم و رواج ہماری تقاریب میں گھس گئے اور اب مغربی معاشرہ و تمدن کے اثرات راستہ بنا رہے ہیں۔ تمام غلط بیرونی اثرات سے نکلنے کے لیے ایک مہم ضروری ہے اور شاید شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے پہلے اصلاحی کام ہونا چاہیے۔

اس معاملے میں معاشرے کے سامنے سر جھکا دینے کے بعد پھر آپ تبلیغی جماعت کی طرح کا کام

کر سکتے ہیں، طاغوتوں اور منکرات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اقامتِ دین کا بھرپور کام نہیں کر سکتے۔

محترم قاضی حسین احمد قیم (کالعدم جماعت اسلامی) نے پچھلے دنوں ایک تقریر میں شادی بیاہ کو فضولیات سے پاک کرنے کے جو اصولی دعوت کارکنوں کو دی ہے، اُس کا علم ہوتے ہی مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں جہاں ایک طرف شادیوں اور ولیموں کے نئے پُرشکوہ ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر اتنا دلگیر تھا کہ کئی بار خیال کیا کہ کسی شادی میں سرے سے شرکت ہی نہ کی جائے۔ اور دوسری طرف جب میرے دل میں تحریک کے بعد نئے دور کی یہ اجتماعی اُمنگ جاگ اُٹھی کہ جس طرح دوسرے معاملات میں ہمیں اِس بگڑے ہوئے معاشرے کے گندے سمندر سے ایک نئے پاکیزہ جزیرے کو اُبھارنا ہے، اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں بھی نئے طریقے اختیار اور رائج کرنے ہیں۔ جس دینی تحریک نے ہمیں بھائی بھائی بنا دیا ہے، آئندہ وہی ہمارے نئے تعلقات اور رسومات کی بنیادیں فراہم کرے گی۔ اس سلسلے میں کچھ کام بھی ہوا، مگر پھر ماحول نے وہ وہ چکر دیئے کہ سب کچھ فراموش ہو گیا۔ اور ہم نے معاشرے میں اپنی نئی مقام پیدا کرنے کے بجائے رسمیات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ رسو میرے لیے قاضی صاحب کا ایک ذرا سا جملہ سوتے ہوئے احساسات کو جگانے کا بہانہ بن گیا۔ لطیفہ کے طور پر کہنا ہو تو کہہ لیجیے کہ "قاضی با قاضی می سازد"۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب

۱؎ ہمارے حلقے سے وابستہ لوگوں نے ایسی بھی مثالیں قائم کی ہیں کہ دولہا صاحب مردانہ طلائی زیورات سے مرصع ہو کر تشریف لائے اور لڑکی والوں کے متوسط الحال سے خاندان سے گن گن کر اسبابِ جدید کے مطالبے پورے کرائے گئے۔ ایسے تماشے بھی دیکھے کہ لڑکی والوں کے ہاں کسی بند کوٹھڑی میں محض چھوٹی ڈھولک بج رہی تھی، مگر جب بارات کی آمد کا وقت ہوا تو لڑکیوں نے دوڑ بھاگ کر اُسے چھپانے کی کوشش کی کہ اسلامی طرز کی بارات والے کیا رائے قائم کریں گے، مگر ستم یہ ہوا کہ اس "اسلامی بارات" میں سب سے پیش پیش بے پردہ عورتوں کی ایک ٹولی نکلی اور اُن کی سرغنہ صاحبہ نے آوپہنچ کر زور زور شور سے خود گانے بجانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (نعیم صدیقی)

کو بہت سے تحسینی خطوط موصول ہوئے اور کارکنوں میں نہایت اچھا احساس ابھرا۔[1]

میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمیں اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بالائی مشاورت میں اپنے اصول و معیار دین کے مطابق مگر اعتدال پسندانہ طریق سے طے کر لینے چاہئیں۔ اور پھر امید کرنی چاہیے کہ ہمارا کوئی رفیق یا حامی ان کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

آج کل جتنی چیزیں میں نے غلط شکل میں ہوتی دیکھیں ان سب کا عذر بڑے بڑے "اساطین" تک نے یہ بیان کیا کہ کیا کریں اب لڑکے نہیں مانتے، یا بیوی یا برادری نہیں راضی ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگ نہ اپنے گھر کے لیے کبھی قوّام (لیڈر) بن سکے ہیں، نہ انہوں نے بیوی بچوں کی بیس تیس برس میں کوئی تربیت کی اور نہ اپنی برادری پر اپنی اخلاقی فوقیت کا کوئی سکہ بٹھایا۔ دوسرے معنوں میں باہر تو وعظ کہے جاتے رہے، مگر اندر شیطان بدعات و رسمیات کا محاذ بناتا رہا۔ ہمارے دوست اپنے گھروں کے اندر اپنے نظریات و مقاصد کے خلاف ایسے تباہ کن محاذ بنتے اور پھیلتے ہوئے دیکھتے رہے اور کبھی انہیں احساس نہ ہوا کہ بہت سے آلہ و طواغیت ان کو ان کے اپنے گھر میں شکست دینے کے سامان کر رہے ہیں۔ اور آج تو شیطانِ مغربیت کی بنیادی پالیسی ہی یہ ہے کہ عورتوں کو ہپناٹائز کر کے اور بچوں کو تفریحات کی ٹافیاں کھلا کر اور جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو فحاشی و لذّتیت کی ہیروئن کا عادی بنا کر مسلم گھروں کے ان قلعوں کو توڑ دیا جائے جن کے فراہم کردہ تحفظ کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے آداب و شعائر کسی نہ کسی طرح اب تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔ نیز گھروں میں بزرگوں، خصوصاً اسلامیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ماؤں، دادیوں، نانیوں اور پھوپھیوں کو اس حد تک بے بس کر دیا جائے کہ وہ نصیحت کرنا تو کجا، زندگی کے مشکل مرحلوں کو نوجوان

---

[1] مجھے اس تحریر کو لکھنے کے دوران میں یہ معلوم کر کے اور مسرت ہوئی کہ ہمارے رفقاء نے اصلاح احوال کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جو اپنی تجاویز مرتب کر کے دے گی۔ آخری فیصلہ جو کچھ ہوگا، میں اس کا ساتھ دوں گا۔ مگر اس وقت تو میں یہ تحریر بڑی حد تک لکھ چکا ہوں، اور میرے خیال میں کوئی بات خلافِ اسلام اس میں نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ تغیرات و توضیحات میں دوسروں کی رائیں مجھ سے بہتر ہوں۔ (ن ص)

کے سہارے طے کرنے کے لیے کچھ غلط حرکات کو دیکھ کر خاموش بھی رہیں اور طنز و تمسخر بھی برداشت کریں۔

میرے سامنے جب پہلے پہل کراچی کی بعض دولت مند تاجر برادریوں کی طرف سے شادی بیاہ کے لیے طے شدہ ضابطے آئے اور ان ضابطوں پر عمل بھی ہوتے دیکھا اور سنا تو مجھے صدمہ ہوا کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا اور زیادہ معیاری اور بہتر طور پر کرنے کا تھا اس میں ایسے دوسرے لوگ بازی لے گئے جو دنیا دار کہلاتے ہیں۔

اپنے ہاں بھی خال خال مثالیں ایسی اُبھریں کہ انہیں دیکھ کر دل سے بے اختیار دعائیں نکلیں، مگر ایک تو وہ شاذ ہیں، دوسرے اُن کی خوبی کو اس پر محمول کیا گیا کہ غریب لوگ ہیں، حالات بہتر ہوتے تو یہ بھی سب کچھ کر گذرتے۔ مگر میں اپنے بعض دوستوں اور رفیقوں کو جانتا ہوں کہ وہ اصولاً اور مسلکاً ایک خاص طرز پر سوچنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہمارا سرمایۂ افتخار اور ہمارے لیے نمونہ ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں منزل اوّل رشتے کی تلاش ہوتی ہے۔ لڑکا اگر پیسے والا ہو (اور مشرق وسطیٰ میں تیل سونا رکھنے والے ممالک نے کتنے ہی ان پڑھ اور بدصورت لوگوں کو دولت مند بنا دیا ہے) تو ماں بہنیں چراغ لے کر کسی ایسی چاند سے مکھڑے[1] کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں جس کے پیچھے پیچھے دولت کی ندی بھی بہتی چلی آئے۔ کہیں اَن پڑھ لڑکوں سے ایم اے پاس لڑکیوں کا

---

[1] اس مادہ پرست اور جسم پرست اور چہرہ پرست معاشرے میں سارا حسن بال اور کھال اور رخ و خال تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ کتنے ہی سادہ اور سانولے چہروں کے پیچھے خوش اخلاقی، وفا شعاری، طاعت گذاری اور حفظِ عصمت و ناموس کا ایک خزانۂ حسن مخفی ہوتا ہے۔ ایک حُسن نگاہوں کے لیے عارضی سامانِ فریب ہوتا ہے، دوسرا حسن ساری زندگی کو پُرنور بنا دیتا ہے، مگر بگڑے ہوئے سطحی ذوقِ حسن کو تبدیل کون کرے۔

جوڑ لگا دیا جاتا ہے، کہیں بدصورت نوجوانوں سے انتہائی نرم و نازک لڑکیاں وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ پھر یہ ستم بھی ہوتا ہے کہ پینتالیس سال کا مرد کسی ۱۸ سال کی لڑکی کو شکار کر لے جاتا ہے اسی طرح لڑکی والے بھی یہ دیکھیں گے کہ لڑکے کے پاس پیسہ وافر ہے۔ ڈاکٹری، انجینیری، اعلیٰ سرکاری عہدہ یا کوئی بڑا بزنس ہے۔ الگ گھر ہے، ساس نندوں سے تو سابقہ نہیں پڑے گا وغیرہ حالانکہ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی لڑکا یا لڑکی یا اُن کے گھرانے تحریکی لحاظ سے یا کم سے کم دینداری اور پردہ داری کے لحاظ سے کیسے ہیں۔ باقی ساری چیزیں علی الترتیب بعد میں دیکھنے کی ہو سکتی ہیں۔ اگر پہلی شرط معیاری طور پر پوری ہو تو دوسری ساری ضروریات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ گذر بسر کے کم سے کم انتظامات اور عمر اور تعلیم کے توازن و تناسب کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔

حال یہ ہے کہ معاشرہ میں شادی مارکیٹ گویا دَورِ قدیم کے نخاس بازار رقیق کی مانند ہے کہ لونڈیاں قطار در قطار کھڑی ہیں، دیکھیے، ٹٹولیے اور بھاؤ تاؤ کر کے مال سنبھالیے۔

تحریک اسلامی تو اس قسم کی منڈی سے نفرت کرتی ہے۔ اسلام اگر معیار ہو گا تو اس کی سوئی گھوم کر خود بتائے گی کہ امکانی صورتوں میں سے کدھر کا رُخ کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ان نئے جعلی معیاروں کے ساتھ ساتھ خاندانی اور نسلی حدبندیوں کی پرستش کرنے والے بھی موجود ہیں۔ چاہے لڑکی ساری عمر جہنم میں رہے یا لڑکا گھر کی فضا کے درد کا درمان آوارہ گردی میں تلاش کر لے، یا تعلیمی اور معاشی لحاظ سے آپس میں کبھی بات نہ بنے، ہر پھیر کے مقررہ کولہو میں دو افراد کو جوتنا ضروری ہے۔

پرانی جاہلیتوں میں سے ایک جاہلیت یہ کارفرما ہے کہ رشتے طے کرنے سے لے کر، جو پرانے حلقوں میں اب بھی بچپن سے طے ہو جاتے ہیں، شادی اور اس کے سارے مقتضیات تک کو اندھا دھند طے کرنا بڑوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، اور ان کے فیصلے گویا ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے سے ہوتے ہیں۔ کسی مرحلے پر بچوں سے کچھ پوچھنا، مشورہ لینا یا کسی واسطے سے اُن کا عندیہ معلوم کرنا تو بالکل خارج از بحث ہوتا ہے۔ مائیں جو اولاد کے رجحانات نسبتاً

زیادہ جان لیتی ہیں۔ وہ اوّل تو بول نہیں سکتیں اور بول لیں تو لڑائی جھگڑے بلکہ مار دھاڑ کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو روایت کی کُند چھری سے ذبح ہوتے ہوئے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ ان کے سامنے جاہلی رواج کا قصائی چھری پھیر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے اس طریقے کو شرعی سمجھ لیا گیا ہے کہ ماں باپ جو چاہیں کر دیں، حالانکہ شریعت نے لڑکے کا معاملہ تو الگ، لڑکی تک سے یہ پوچھنے کو لازم ٹھہرایا ہے کہ آیا وہ پیشِ نظر صورت میں راضی ہے۔ مگر اوّل تو کوئی لڑکی جس مروجہ جاہلیت کے قفس میں ہوتے ہوئے نفی میں جواب دینے کی جرأت نہیں کر سکتی، لیکن اگر کرے (جس کی شاذ عملی مثالیں میرے سامنے ہیں) تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاں کہہ دے۔ وہ ماں باپ کی عزت کے سامنے ہتھیار ڈال کر ساری عمر کی بپتا سہیڑ لیتی ہے۔

اس جاہلی طرزِ عمل کا ردّعمل نوجوانوں کی طرف سے کسی دوسری جاہلیت کی شکل میں رُونما ہوتا ہے۔ ایک تو پرانا طریقہ اغوا وغیرہ کا۔ اور دوسرے نیا طریقہ خاندانی روایات سے کلیتہً بغاوت کرنے کا۔ یہ دونوں خرابیاں دراصل نتیجہ ہیں پہلی بُرائی کا۔ میں کبھی کبھی یہاں تک سوچنے لگتا ہوں کہ کسی قسم کے جاہلی ردّعمل میں پڑ کر غلط روش اختیار کرنے کے بجائے کوئی شعور رکھنے والی خوددار لڑکی سوال کرنے والے "وکیل" سے صاف صاف کہہ دے یا نکاح خواں کو پرچہ لکھ کر بھیج دے اور کہہ دے کہ یہ صورت مجھے منظور نہیں ہے اور میں شریعت کے دیے ہوئے حق کو استعمال کر رہی ہوں۔ مغربی طرز کی آزادیِ نسواں کی تحریکیں چلانے والی بیگمات کے مشغلوں کی سطح دوسری ہے۔ اس عام سطح کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑکیوں کے اندر صحیح اسلامی حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلنی چاہیے۔

میں اپنی ان گذارشات کے لیے اپنی جگہ دلائل رکھتا ہوں، مگر ضروری نہیں کہ ہر بات کو دوسرے قبول ہی کریں۔ ہاں میں صرف ایک اصول کے متعلق اپنے ہم فکر دوستوں سے یہ ضرور اصرار کرتا ہوں کہ وہ ہونے والے زوجین کے صحیح اور حقیقی رجحانات کو مختلف طریقوں سے معلوم کریں۔ فیصلے کو التوا میں رکھ کر بار بار اس کے متعلق اندازہ کریں کہ یہ رضاکارانہ طور پر بلکہ دلی مسرت

سے قبول کیا جانے گا یا چارہ و ناچارہ۔

دراصل والدین اور اولیا کی اپنی بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کہیں بڑوں کے دیرینہ حسنِ تعلقات کا تقاضا سامنے ہوتا ہے، کہیں کسی زمین کا لین دین اٹکا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی بھاری قرض لیا ہوا ہوتا ہے یا لینا ہوتا ہے، کہیں کسی عزیز کو نوکری دلوانے کی راہ نکلوانی ہوتی ہے، کہیں کاروباری مفاد سامنے ہوتا ہے، کہیں سیاسی تقاضے دباؤ ڈالتے ہیں۔ مگر یہ سارے معاملات بڑوں کے اپنے معاملات ہیں، جن کی وجہ سے اولاد کی شادی کے معاملہ میں نہ دلی میلان کی پروا کی جاتی ہے، نہ اُن میں تعلیمی ہم مرتبگی کو دیکھا جاتا ہے، نہ اُن کی عمروں کے تفاوت کا کوئی احساس ہوتا ہے، اور نہ اُن کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کے بیّن فرق پر نظر جاتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ بڑوں کے مصالح و مفاد اپنی جگہ، مگر وہ اولادوں کے ازدواجی مستقبل کو اُن کی قیمت میں دینے کا حق نہیں رکھتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح و ازدواج کو سادہ اور آسان بنانے کی سعی بھی کی، تعلیم بھی دی اور عملی نمونہ بھی نہ صرف خود اپنی طرف سے پیش فرمایا بلکہ اپنے صحابیوں کی زندگیوں میں اس کی جھلک پوری شان سے پیدا کی۔

بخلاف اس کے ہمارے یہاں نکاح اور شادی کو ایک بارگراں بنا دیا گیا ہے۔ لوگ اجزا کو سنت کے تحت جواز دینے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس مجموعی کارروائی کے لیے جو وسیع سنّت ہمیں ملتی ہے، اُسے قبول نہیں کرتے اور قبول نہ کرنے والوں کے پاس ہزاروں دلائل ہیں۔ یہ بھی کہ وہ غربت کا دَور تھا۔ یہ بھی کہ آج کے ماحول کے کچھ نئے تقاضے ہیں، آج شادیوں کی تقریبیں سیاسی اور سماجی تعلقات بڑھانے اور معاشرتی مرتبہ بنانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شادی آج اس معنی میں بارگراں ہے کہ صرفِ دولت تو اسراف کی تمام حدوں کو توڑ ہی چکا ہے، اس کے ساتھ نمائشِ دولت اور مظاہرۂ دولت کی ایک اور بلا چمٹ گئی ہے۔ نمائشِ دولت کا یہ فتنہ شادی کارڈ سے لے کر بری اور جہیز اور ولیمہ تک ہر جگہ رقص کرتا نظر آتا ہے۔

حالانکہ اصلاً شادی، نکاح یا ازدواج کا سارا کھیل اتنا ہی تھا کہ مجلس میں گواہوں کے سامنے

ایجاب قبول ہو، خطبۂ نکاح پڑھا جائے، دُعا مانگی جائے اور ان مراحل میں ضرورت کی حد تک اعلانِ نکاح ہو جائے اور بس۔

مگر آج جس طرح کا تماشا ہوتا ہے اس کے چند پہلو عرض کیے جا رہے ہیں۔

اس دور میں شادی کا پہلا شگوفہ دعوت نامہ یا شادی کارڈ کی شکل میں پھوٹتا ہے۔ آرٹ کے نادر سے نادر نمونے، کاغذ کی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام، کارڈوں اور لفافوں کی مختلف اشکال میں کٹنگ، رنگوں کی کرشمہ سازیاں، ہم جیسے درویش مزاج لوگوں کے دل تو کارڈ دیکھ کر ہی دہل جاتے ہیں، نہ معلوم ایسے کارڈوں سے جو کھیل کھیلا جائے گا وہ خود کیسا ہوشرُبا ہو گا۔

پھر اُستادِ فرنگستان کی پسند کے عین مطابق یہ کارڈ "بیگم و مسز فلاں" کی طرف سے جاری ہو گا یعنی گھر پر مہمانوں کو بُلانے کے لیے صاحبِ خانہ اور قائدِ خاندان کا فرلینڈہ ہونا کافی نہیں۔

شریف و سنجیدہ لوگوں کو سیدھی طرح یہ طے کرنا چاہیے کہ ۵″×۳″ (یا ۳م × ۵م) سے بڑے سائز کا کارڈ کسی بھی صورت میں جاری نہیں کیا جائے گا۔ سیدھی طرح صاحبِ خانہ کی طرف سے دعوت دی جائے گی۔ کارڈ سادہ قسم کے سفید کاغذ پر ہو گا اور بغیر کسی آرٹ ورک کے سیدھی سادی یک رنگی (سیاہ یا نیلی) تحریر میں چھپا ہو گا۔

یہ ہے تبدیلی کا نقطۂ آغاز!

شادی کی تقریب کو ایک بڑی کانفرنس یا سیمینار بنانے کے لیے ہزاروں دعوت نامے رشتہ داروں اور دوستوں، سرکاری افسروں، ادیبوں اور شاعروں، اخباری شخصیتوں کے نام نہ صرف شہر میں بلکہ ملک بھر کے مختلف گوشوں میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ حالانکہ لڑکے والے ہوں یا لڑکی والے، اتنا کافی ہے کہ چند قریبی رشتہ داروں کو بلایا جائے۔ چند اہم ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں کو مدعو کر لیا جائے۔ اور بقیہ حلقۂ تعارف کو اگر خطوط جائیں تو اس مضمون کے ہوں کہ آپ اس تقریب کے لیے وقت، پیسہ، جسمانی تکلیف اور کام کے ہرج میں نہ پڑیں، صرف تقریب کی کامیابی اور زوجین کے حسنِ تعلق کے لیے دُعا فرمائیں۔

اب اگر ہر صحافی، ہر عالم، ہر ادیب، ہر سیاسی لیڈر، ہر سرکاری افسر اور تحریک اسلامی کا ہر نمایاں فرد یہ چاہے کہ وہ بچے یا بچی کی شادی کی تقریب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہم رنگ لوگوں کو جمع کر کے خاص طرح کے اثرات پیدا کرے گا تو اس طرح تو اصلاحِ احوال ممکن نہیں۔ قصبوں اور بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ ہزاروں کا مجمع جمع کر لیتے ہیں۔ اور ان کی تقلید میں شہر کے متوسط الحال اور محنت کش بھی امکانی حد تک ایک ہجوم کا انتظام کرتے ہیں، پھر اس سے آگے دیہات کے جاگیردار اور وڈیرے تو الگ رہے، معمولی حالات کے لوگ بھی ایک انبوہ بہم کر لیتے ہیں۔

حالانکہ ایسی تقاریب بسا اوقات تو بار گراں بھی بن جاتی ہیں۔ مثلاً پچھلے دو ماہ میں صرف اپنے شہر سے ہی مجھے ہر ہفتے کبھی ایک اور کبھی دو دعوت نامے موصول ہوئے۔ اب ان میں جا کر کون کس سے کیا سیاسی یا ادبی یا صحافی اثر لیتا ہے۔ ہر کسی کو جلدی پڑی ہوتی ہے، نکاح میں شمولیت کی یا ولیمہ کھایا اور رخصت۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

مجھے اصرار ہے کہ بنیادی طور پر ان تقریبوں کو گھریلو اور خاندانی حد تک محدود رہنا چاہیے! دو چار افراد کو ہم مقصدی یا کسی خاص تعلق کی بنیاد پر بلایا جا سکتا ہے۔ مگر کوشش یہ کرنی چاہیے کہ لڑکی اور لڑکے والے دونوں گھروں میں ۵۰،۵۰ سے زیادہ مہمان (مع خواتین) نہ ہوں۔ زیادہ بڑی قریبی برادری والوں کو کسی قدر ڈھیل مل سکتی ہے، مگر ایسی نہیں کہ وہ میلہ ہی لگا دیں۔

شادیوں کا ایک بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سسرال والے کیا دیں گے یا لڑکوں کی طرف سے بری کیسی آئے گی۔ اور مہر کتنا ہو گا۔ اور لڑکی والے جہیز میں کیا کچھ دیں گے۔ بلکہ شادیاں طے ہونے میں یہ سوال بہت دخل رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سچے مسلمانوں کے سوچنے کا یہ انداز ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ کجا یہ حال کہ آج کل ایک دوسرے سے مطالبے کیے جاتے ہیں، خصوصاً لڑکی والوں کو تو مجبور کیا جاتا ہے کہ اتنے تولے سونا اور فرج اور ٹیلی وژن ضرور دینا ہو گا۔

اس ذہنیت کو یکسر ختم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں طرف سرمایہ، اسلامیت ہے اور دولتِ شرافت

ہے تو پھر کسی فریق کو دوسرے کے متعلق نہ خاص اُمیدیں لگانی چاہئیں، نہ مطالبے کرنے چاہئیں، اور نہ ساری عمر لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو، اور نہ لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی اور اس کے والدین کو یہ طعنے ملنے چاہئیں کہ تم لوگوں نے تو حق ادا کیا ہی نہیں، وغیرہ۔

اس معاملے میں دونوں طرف غیرت و حمیت اور بے نیازی و خودداری ہونی چاہیے۔ جو کچھ لڑکے والوں کی طرف سے از خود ہو سکے وہ قبول، اور اس طرح لڑکی والوں طرف سے رضا کارانہ اور مخلصانہ جذبے سے جو کچھ ہو سکے وہ منظور۔

بلکہ دونوں فریق ابتدا ہی میں مل کر یہ بات ہمدردانہ جذبات سے طے کر لیں کہ بھائی نہ اپنے اُوپر بے جا بوجھ ڈالنا اور نہ قرض لینا اور نہ برائے نمائش کوئی کام کرنا۔ اور یہی مشورہ دوسری طرف سے ہو۔ جو کچھ جس کے بس میں ہو وہ وہی کچھ کرے۔ جیسا کھانا دے سکتا ہے، دے ___ اور جیسا سامان وہ فراہم کر سکتا ہے، کرے۔ دونوں طرف صاف دلی سے اپنے اپنے گھروں کے تمام لوگوں کو اس پر پہلے سے مطمئن کر لیں کہ ہمارا اصل مقصد رشتہ و ربط ہے، کسی دُنیوی مفاد کو کمانا مطلوب نہیں ہے۔

کتنی ہی ہماری بہنیں اور بیٹیاں شریف دینی گھرانوں میں باوجود تعلیم اور شکل و صورت اور رفاہ عامہ کی مہارت کے کنواری بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں، مگر ان کو معاشرہ اس امر کی سزا دیتا ہے کہ تمھارے والدین اور تم اتنی مقدار میں جہیز فراہم نہیں کر سکتے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ہم میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ اس طرح کی دردناک صورتوں میں کسی مظلوم بچی یا خاتون کی دستگیری باوجود خوش حالی کے، اور باوجود دولت مند گھرانوں سے رشتے ملنے کے، کی گئی ہو۔

اسی طرح دوسری جانب یہ عبرت انگیز نقشہ بھی موجود ہے کہ کسی غریب مگر نیک نہاد اور قابل نوجوان کو کوئی گھر اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ کوئی بڑا مہر نہیں دے سکتا یا شاندار بری نہیں لے سکتا۔ یا الگ رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں بنوا سکتا۔

نتیجہ یہ کہ لوگ اسلامیت اور شرافت اور پردہ داری کے بالمقابل بالکل تارکِ دین اور غلامانِ مغربیت و اشتراکیت تک سے تار و رہ جا ملاتے ہیں۔

کوئی اپنے بلند معیارات سے نیچے اُترنے پر تیار نہیں ہے، کوئی اپنی مالی سطح سے نیچے نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ اور کوئی اپنے گھرانے سے باہر جھانکنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اور اسلام دُور کھڑا یہ سارا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ قیمتی ہیں وہ چند افراد جنہوں نے ان سلاسل و اغلال کو توڑ کر اسلامیت کے علم کو بلند کیا ہے! فکثّر اللہ امثالھم۔

میری نگاہ سے کفو کا مسئلہ اوجھل نہیں ہے۔ اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ مگر کفو کے مفہوم کو متعین کرنے میں فرق ہو سکتا ہے۔

کفو کے مسئلے کا صحیح مفہوم ان مناکحتوں کے تفصیلی مطالعہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں، اور پھر جن کا انعقاد صحابہ کرام کے مختلف قبیلوں کے درمیان کرایا۔ ایک کلمہ و مقصد کے مہاجرین و انصار کے درمیان کفو کا وہ تصور وسیع ہو گیا جو دورِ جاہلیت میں انتہائی محدود تھا۔

بعد کے احوال و واقعات نے تبدیلیاں پیدا کیں۔ جب پیشے نسلاً در نسل چلنے لگے تو آسانی اسی میں سمجھی گئی کہ کاشتکاروں کی اولاد، نوربافوں کی اولاد، کفش دوزوں یا کمہاروں کی اولاد، اور اسی طرح عالموں یا مولویوں کی اولاد اگر اپنے ہی جیسے گھروں سے مربوط ہو تو ذوق و عادات کی ہم آہنگی اور گھروں میں بولی جانے والی اصطلاحات اور مخصوص قسم کے رواجوں اور روایات کا فہم سہل تر ہو گا۔

اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ہمارا پالا ہندو سوسائٹی سے پڑا جو چار حصوں میں تقسیم تھی اور ہر حصے کے فرائض جُدا جُدا تھے۔ لہٰذا ہر حصے کے لوگ اپنے ہی سلسلے کی برادریوں میں جگہ پا سکتے تھے۔ اس حالت کو پہنچ کر ہمارے ہاں کفو کا تصور اور بھی بوجھل پتھر بن گیا۔

لیکن آج جب کہ مختلف پیشوں اور مشاغل کا تسلسل درہم برہم ہو چکا ہے، تعلیم اور عہدوں نے پرانے خاندانوں سے اُٹھنے والی اولادوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کفو کے مسئلے پر نظرِ ثانی کی جائے۔ کفو کی اصل حقیقت یہ ہے کہ دو گھروں کے زوجین جب ہم ہو گئے تو ان کی تعلیم، ان کا ذوق، ان کا مقصد، ان کی عادات اور ان کے طور طریقے یگانگت پیدا کرتے

میں مند ہونے چاہئیں۔ نیز دونوں طرف کے خاندانوں میں بھی معاشرت کی کوئی خلیج حائل نہیں رہنی چاہیے۔
میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والے تعلیم یافتہ، شریف اور باعصمت زوجین دوسری کسی صورت کے مقابلے میں ہزار گونہ زیادہ اسباب ایسے رکھتے ہیں جن پر کفو کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔
ایسے ہم عقیدہ و ہم مسلک لوگوں کو تو آغاز کار اس ادراک حقیقت سے کرنا چاہیے کہ کلکم من آدم و آدم من تراب۔

اب میں بارات کی تیاری کے مسئلے کو لیتا ہوں۔
رواج ہو گیا ہے کہ بڑی بارات لے کے جایا جائے اور رعب بٹھایا جائے کہ ہمارا دائرۂ اثر بڑا وسیع ہے۔ دائرہ اثر ہر ایک کا اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ سو ڈیڑھ سو یا دو سو آدمی اکٹھے کر لے جائے، اور باراتوں میں بہت سے آدمی اکٹھے کر لینے کے معنی یہ بھی نہیں ہوتے کہ کسی طرف حقیقی رتبہ بلند یا سماجی مرکزیت موجود ہے۔ ہو بھی تو اس کی نمائش کی کیا ضرورت۔ آپ دوسروں (جو درحقیقت اپنے ہی ہیں) کے سر زیادہ بوجھ ڈال کر فخر کیوں محسوس کریں۔
پھر ایک تماشا دولہا کے ہار سنگھار کا ہوتا ہے۔ پہلے طلے والے کئی ہار پھر اوپر نوٹوں کے ہار۔ کہیں ایک ایک روپے[1] والے نوٹوں کے ہار بنے بنائے خریدے جاتے ہیں، کہیں دس دس روپے والے اور کہیں سو سو روپے کے نوٹوں کے۔
یہ تو گویا صریح طور پر اظہار ہے وافر دولت کا، یعنی دولت اچھل رہی ہے، ابلی پڑتی ہے۔ بالعموم اس قسم کے ہار کم پڑھے لکھے، کاروباری لوگوں میں رائج ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی کلرک اور جمعدار تک یہ ڈراما کرتے ہیں اور یا پھر مشرقِ وسطیٰ سے کمائی کر کے لانے والے محنت کشوں کے گلے میں دولت کے یہ بند صن زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔
بھئی اگر دولہا کو عام بارات سے ذرا سا نمایاں ہی رکھنا ہے تو گلاب کے پھولوں کا ایک ہار

---

[1] اس مقصد کے لیے بڑی مقدار میں یہ نوٹ کھلی بلیک مارکیٹ میں بکتے ہیں۔

اس کے گلے میں ڈال دو، اور بقیہ باراتیوں کو موتیے کا ایک ایک ہار دے دو۔ ضرورت کے لیے تو اتنا کافی ہے۔ اگرچہ میں نے حال ہی میں ایک ایسی مثالی شادی کی مثال اور مختصر بارات بھی دیکھی ہے کہ دولہا تک ہر قسم کی خصوصی آرائش سے بے نیاز تھا۔ واہ وا!

پھر دولہا کی کار سجتی ہے۔ اس کے لیے ملنے کی بھی اور پھولوں کی بھی ایسی جالیاں بکتی ہیں جو کاروں کو "پہنا" دی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر کار کو ضرور نمایاں ہی کرنا ہو تو اس کے سامنے کے شیشے کے اُوپر کی جانب پھولوں کا ایک ہار، یا گوٹے یا ملنے کی ایک سادہ سی لڑی کافی ہے۔ اسے محض ایک علامت کی حد تک رہنا چاہیئے۔

مجلس نکاح کا انعقاد بالعموم محلّے کی قریبی مسجد میں ہو تو افضل ہے، ورنہ کسی اور قریبی کشادہ جگہ پر نشست کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ مجلس نکاح کے عام شرکاء کی تواضع زیادہ سے زیادہ کسی ٹھنڈے مشروب یا چائے کی پیالی سے کر دینا کافی ہے۔ کھانے کا انتظام صرف بارات کے لیے ہو اور بالکل حدِ استطاعت میں۔ لیکن کھانے پینے کے تمام انتظامات خواہ لڑکی والوں کے ہاں ہوں یا لڑکے والوں کے ہاں (خاص طور پر ولیمہ)، ہرگز "بوفے" سسٹم پر نہ کیے جائیں۔ یہ اسی تہذیبِ اغیار کی ایجاد ہے جس کے خلاف ہماری اُصولی لڑائی ہے۔ اس کے طور طریقوں کی تقلید سے انتہائی طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرسیوں کا انتظام نہ کر سکیں وہ دریاں بچھا لیں، جہاں ایک ہی مرتبہ سارے حاضرین کی تواضع ممکن نہ ہو (حالانکہ ۵۰ کی تعداد ایسی نہیں) تو دو نشستیں کر لی جائیں جیسے کہ ہمارے ہاں قدیم دستور رہا ہے۔ ان لوگوں کے تو ذہن ناقابلِ فہم ہیں جو ہزاروں روپے دوسرے اُمور پر خرچ کرنے کے بعد صرف کرسیوں یا دریوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے (ہائے بیچارے مفلسینِ قوم!)

لڑکے والے گھر میں زور شور سے اور لڑکی والے گھر میں کسی قدر کم پیمانے پر روشنیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ حد کر دیتے ہیں۔ ۵۰، ۵۰ ٹیوب لائٹیں لگی ہیں۔ عمارت کی دیواروں اور درختوں اور جھاڑیوں کو چھوٹے چھوٹے رنگدار بلبوں کی کثیر تعداد سے آراستہ کیا جاتا ہے، بسا اوقات روشنیوں کی لمبی قطار دُور سڑک تک جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔

میں نے خود دیکھا کہ ایک کوٹھی پر تین چار دن تک رنگ برنگی روشنیوں کو اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ شاید ہی کوئی انچ جگہ خالی ہو۔ ایسے مناظر کیا روٹی اور دوا سے محروم غریبوں کا خون نہ کھولا دیتے ہوں گے۔ بجلی کی کمی کا ماتم تو الگ رہا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کام کرنے یا مہمانوں کو بٹھانے یا کھانا کھلانے کی جگہ اعتدال سے روشنی کا انتظام کیا جائے۔

ہم لوگ جس دولت کو اس طرح اڑا دیتے ہیں کیا یہ دوسروں کی حق ماری نہیں ہے اور کیا ہمیں پیسے پیسے کا حساب آخرت میں نہیں دینا ہوگا۔ کیا دُنیا اندھیر نگری اور دولت ایک خوانِ یغما ہے کہ جس کا جتنا جی چاہے لوٹ لے اور پھر اس کو چاہے تو دریا برد کر دے، چاہے تو آگ لگا دے۔ جی نہیں! یہ خدا کے خزانے کا مال ہے اور اس کے ہر ذرّے کا حساب دینا ہوگا۔

پھر کہیں باراتوں کے ساتھ بینڈ باجے اور گولے پٹاخے ہیں اور کہیں لڑکے والوں کی طرف سماعت شکن واہیات ریکارڈنگ کا طوفانی شور ہے اور لڑکی والوں کی طرف "گھڑے متھالی" اور ڈھولک کے پاکیزہ گھریلو گیتوں سے معاملہ آگے بڑھ کر "اپوا" والی ثقافت تک جا پہنچا ہے۔ کچھ فلمی بول بھی ہیں، کچھ دھمال لڈی بھی ہے، فن کی ماہرات بھی جا شامل ہوتی ہیں بلکہ بلوائی جاتی ہیں۔

گویا شادی نہ ہوئی کوئی سلطنت فتح ہو رہی ہے اور اس کا جشن منایا جا رہا ہے۔ اسلام میں تو ایسا جشن بھی سجدۂ عبودیت سے منایا جاتا ہے۔

یہ مسلمان جن کے آدھے بھائی افغانستان اور فلسطین، لبنان اور شام، بھارت اور حبشہ، فلپائن اور افریقی ریاستوں میں ہزار در ہزار ذبح ہو رہے ہیں اور آدھے بھائی مہاجر بن کر دُنیا کے متعدد کیمپوں میں پڑے ہیں، اور جن کے ایک طرف روس اور دوسری طرف بھارت جدید اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کا یہ حال ہے۔

ان ساری لغویات کو چھوڑ کے بغیر الٰہِ واحد کی عبادت اور اس کے دین کی سربلندی کا کام

نہیں کیا جا سکتا۔

شادیوں میں لڑکے اور لڑکی والوں کے گھروں میں چاہے کچھ پردہ بھی ہو، مہمان خواتین کی وجہ سے بے پردگی کی بہار آتی ہے کہ لباسوں کی رنگینی اور زیورات کی چمک دمک اور میک اپ کی قہر مانی کا طوفان دین و اخلاق کی ساری قدروں کو بہالے جاتا ہے۔ میں نے ایسے جو منظر دیکھے ہیں ان کی وجہ سے تقاریب نکاح کی کراہت دل میں بیٹھ گئی ہے۔

شریف دیندار لوگوں کو نہایت جرأت کے ساتھ دعوتی کارڈ کی پشت پر ضروری گذارشات میں یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ جو خواتین شریک ہوں، براہ کرم لباس اور زینتوں اور میک اپ کو چھپاتے والے مکمل پردے کے ساتھ شریک ہوں اور مردوں میں گھسنے اور دروازے سے بار بار جھانکنے سے پرہیز کریں۔ یہ بات محذوف ہی رہنے دی جائے کہ جن سے یہ پابندیاں نہ اٹھائی جا سکتی ہوں وہ معاف ہی رکھیں۔ اور اپنے تعلقات کے تقاضے کسی دوسرے وقت پورے کر لیں۔ کیونکہ کسی گھر میں ایسی خواتین کی جبلت بھرت مہمانوں اور محلے داروں پر بھی یہی اثر چھوڑے گی کہ یہ تارکین پردہ کا گھر ہے۔

جس ملک میں پردے کے خلاف امریکہ اور اسرائیل اور روس کی تہذیب نے یہ جنگ چھیڑ رکھی ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین کردہ نظام پردہ کو ختم کرنا ہے، وہاں دوسروں کے لیے اس طرح کی غلط فہمی کا راستہ کھولنا بھی خطرناک ہے۔

یہاں ایک افسوسناک حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ بہت سی صورتوں میں دولہا کی جانب سے شادی کے وقت یا کچھ دیر بعد لڑکیوں سے پردہ ترک کرنے کی شرط منوائی جاتی ہے اور اس شرط کے سامنے ایسے ایسے والدین اور ان کی بیٹیاں تک سر جھکا دیتی ہیں جنہیں اسلامیت اور پردہ داری کے لحاظ سے معروف مقام حاصل ہوتا ہے۔ پردہ کے خلاف ابلیسی جنگ کے ایسے ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے۔

بیچ میں مہندی اور تیل وغیرہ کی رسموں اور ان کی مقررہ شریعت کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ یہ سب

فضول باتیں ہیں، ہندو تہذیب کے اثرات ہیں، ان کو چھوڑ کر بغیر کسی تقریب کے مہندی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ خود لڑکی والے اپنی طرف سے بھی کر سکتے ہیں اور لڑکے والوں کو بھیجنی ہے تو وہ بھی لمبے چوڑے چکروں کے بغیر بھیج سکتے ہیں۔ تیل وغیرہ کو چھوڑ دیئے، لایعنیات کا سلسلہ لمبا نہ کیا جائے۔

اب لیجیے، مہر کی بات!

لڑکی والوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی رقم کا مہر باندھیں اور وہ لڑکے کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ دس ہزار، پچاس ہزار، ایک لاکھ، غرض کہ جس معاشی مرتبے کا لڑکا ہو اُس کے مطابق مقدار مقرر کی جاتی ہے، بلکہ ضد کی جاتی ہے، جھگڑے کیے جاتے ہیں، کبھی تو اس پر رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ دراصل لڑکی والے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رسّہ ہے جو وہ ہونے والے داماد کے گلے میں ڈال کر اُسے اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں اور اس رسّی کا سرا لڑکی کو بھی تھما سکتے ہیں۔ حالانکہ بھاری مہروں نے نہ کبھی ٹوٹتے نکاحوں کو بچایا ہے اور نہ پھلنے پھولنے والے نکاحوں کو کم مہروں نے ناکام کیا ہے۔ مہر ہی نہیں، خرچے لکھوانے اور بعض شرائط منوانے تک بات جاتی ہے۔

دوسری طرف لڑکے والے ہیں جو اس "سودا بازی" میں کم سے کم قیمت پہ تو بات کو لانے کی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اکثر اوقات ایک آواز شرعی مہر کی بھی سننے میں آتی ہے اور اس کی مختلف مقداریں اہل تاویل نے متعین کی ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جہاں کھلے دل سے اپنا اعزاز سمجھ کر لڑکے والے اغنیاء نے بڑے بڑے مہر خوشی خوشی مقرر کیے ہیں، وہاں ایک طرف خود حضورؐ کی طرف سے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا ہوا سادہ سا جہیز ایک دلکش نمونہ ہے۔ دوسری طرف صحابہ کرام کی شادیوں کے مہر ایسے بھی مقرر ہوئے کہ شوہر اپنی بیوی کو علم سکھا دے گا، یا پیغام دینے والا اُمیدوار اسلام لے آئے گا اور اسلام لانا ہی اس کا مہر ہو گا۔

بدیں وجہ مہر کے متعلق کوئی ایسا قطعی منصوص اور صحابہ میں معمول بہ مہر نہ تھا جسے اب صدر صاحب کی طرح "شرعی جمہوریت" کی مانند شرعی مہر قرار دیا جا سکے۔

مہر ایک تو رستہ کشی سے مقرر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ شخص متعلق کی حیثیت کے مطابق اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اگر زیادہ مہر مقرر کرے تو اسے اپنا اعزاز سمجھ کر مقرر کرے۔ عورتوں سے حسنِ سلوک کا بہترین معیار قائم کرنے والے مرد بھی بہترین کردار کے ہوتے ہیں۔

دوسرے مہر صرف شادی کے وقت کی مالی حالت کی بنیاد پر ہی مقرر نہیں کیا جانا، بلکہ مستقبل قریب کے معاشی امکانات کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور ایک مرد کی نگاہ کو دور تک جانا چاہیے۔ آخر اور کاموں کے لیے وہ مستقبل کی اُمید پر قرض لیتا ہے تو نکاح ہی کے لیے مستقبل کی اُمید پر مہر غیر معجّل کی مقدار کیوں زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ مکان بنانے اور گاڑی خریدنے کے لیے تو سُود پر بھی قسطوں والے نظام فروخت میں ذمہ داری اُٹھالی جاتی ہے، آخر بیوی ہی کو اقساط میں کیوں ادائیگی نہیں کی جاسکتی۔

لڑکی والوں کی بھی اسلامیت اور شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ مہر کو مرد کے لیے ایک لگام اور رسّے کی نیّت سے استعمال کرنے کا ذہن ہرگز بیچ میں نہ آنے دیں۔

کسی مرد کا دیندار، شریف اور شائستہ اطوار ہونا ہی اس کا سب سے بڑا مہر ہے۔

اِسی طرح نرمی کے معاملے میں بھی سارا معاملہ مرد یا اس کے خاندان پر چھوڑ دینا چاہیے۔

مہر کی بات آئی تو یہی معاملہ جہیز کا بھی ہے۔ کسی شخص یا خاندان کا یہ سوچنا کہ ایک لڑکی (یا اُس کے والدین) اس کا گھر بھر دے اور شادی ایک معاشی مسئلہ اور کمائی کا ذریعہ بنے، مرد کے لیے تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اگرچہ اخلاقی انحطاط کے موجودہ دَور میں چلو بھر پانی میں ڈوبنے والے نہیں رہے۔ بلکہ تالابوں اور سمندروں کے پانی میں تیراکی کرنے والے لوگ پیدا ہوگئے ہیں، مگر پھر بھی مردانگی کا ایک عزّ و وقار ہے۔ اس کا مقام غیرت و خودداری ہے۔ وہ (یا اس کے گھر والے) اتنی گری ہوئی بات کہنے پر آمادہ ہی کیوں ہوں کہ آنے والی لڑکی کے لیے لازم ہے کہ وہ دولت کا ایک طوفان اور سامانوں کا ایک انبار لے کے آئے۔ مردوں میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم کپڑے اور زیور سے لے کر فرنیچر اور برتنوں تک اور سامانِ آسائش سے لے کر سامانِ آرائش تک سب کچھ حسبِ منشا خود فراہم کریں گے، مگر فریقِ ثانی کے سامنے یہ سوال یا مطالبہ رکھنا کہ

ہمیں یہ یہ کچھ اور اتنا اتنا دیا جائے - ایک طرح کی گداگری ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ تمام والدین اپنی لاڈلی بچیوں کے لیے کچھ نہ کچھ سروسامان کرتے ہیں اور کرنا چاہیے ۔ لیکن حالاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر اتنا خرچ کرتے ہیں کہ بسا اوقات قرض اُٹھا کر بعد میں بڑھاپے کی زندگی نہایت مشکلوں سے گذارتے ہیں ۔

لڑکے والوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ اپنا ہی ایک دوسرا گھر مصائب سے دوچار ہو، یا قرض کی وجہ سے ذلیل وخوار ہو۔ یہ حالت تو رحم کھانے کی ہے۔

جہیز کے معاملے میں (بَری کی طرح) ایک مصیبت یہ ہے کہ اس کی نمائش بے حد ضروری ہے ماں بڑے فخر و ناز سے دکھاتی ہے کہ اس نے کیا کیا زیور بنوائے ہیں، کتنا سونا خریدا ہے، کپڑوں کو پھیلا کر دکھاتی ہے کہ ان میں بیشتر جوڑے "باہر کے" ہیں، ورنہ اگر پاکستانی کپڑے کے ہوں تو ناک نہ کٹ جائے اور سسرال والے بگڑ نہ جائیں - پھر برتن، صوفہ سیٹ، دو دو پلنگ، چار چار بستر، اس سے آگے بڑھ کر فرج اور ٹیلی وژن، ورنہ کم سے کم ریڈیو سیٹ، پریشر ککر، برقی استری، واٹر کولر، ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، چائے کے سیٹ کافی کے سیٹ، فروٹ پیش کرنے کے سیٹ، ڈرائی فروٹ رکھنے کا سامان، دولہا دلہن کے لیے گھڑیاں پھر سنہری کام کے جوڑے، کشیدہ کاریاں، سردی کے خاص لباس ——— غرضیکہ ایک صحن میں پورا انارکلی سما جاتا ہے۔

اُونچے گھرانے کی ریس کرنے والی یہ مائیں پچھلے کئی کئی سال اپنی اور بچوں کی غذائی اور دوائی ضروریات میں کمی کرتی ہیں، پھر قرض چڑھا کر اُسے اُتارنے کے لیے طرح طرح کی مشقتیں کرتی ہیں حتیٰ کہ اُن کی پوری زندگیوں کا چین دو ایک لڑکیوں کے جہیز کی چکی میں پس جاتا ہے۔

مگر خود پرست انسانوں کو اُن پر رحم نہیں آتا۔ کیونکہ اُن کے مقابلے پر کوئی دوسری مائیں زیادہ مال ومتاع لیے موجود ہوتی ہیں - یہ فری کمپیٹیشن کی مارکیٹ ہے ۔ اس میں اخلاق کا سکہ نہیں چلتا بلکہ مال کی قدر مانی جاتی ہے۔

جہیز کے متعلق کسی حالت میں دوسرے فریق کو مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ قرض یا معاشی مصیبت بھگتنے سے روکنا چاہیے - جہیز جو کچھ بھی بنے، حالات کے مطابق سہولت سے بنے - خوشی سے لیا

جائے، دکھاوا نہ کیا جائے (نہ اُس گھر میں نہ اِس گھر میں)، اور کبھی ساری عمر جہیز کی کمی کا ماتم نہ کیا جائے۔ اور لڑکی یا اُس کے والدین کو طعنے نہ دیے جائیں۔

یاد رکھیے کہ کسی معمولی بھالی پردہ پسند دیندار لڑکی کی عصمت و عفت اور اُس کی نگاہوں کی پاکیزگی اور دُنیا کی لذتوں اور کھیل تماشوں سے بے نیازی ایک ایسی گراں بہا متاع ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جہیز ان چیزوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔

پاک دامن لڑکیوں کا مرتبہ اتنا بلند ہے جو لوگ شوخ و شنگ محفل گر دعیناؤں کے ڈسے ہوتے ہیں وہ ساری عمر نسوانی پاکیزگی کو ترستے رہتے ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں ولیمہ بھی ایک بڑا غور طلب اور اصلاح طلب موضوع ہے۔ ولیمہ کا کارڈ بھی اگر الگ سے جاری ہو تو وہ بھی (پہلے ذکر کردہ دعوت نامے کی طرح) سادہ ہونا چاہیے ولیمہ میں کئی کئی کھانوں اور پھلوں کا انتظام کر کے شانِ امارت دکھانے کی ضرورت نہیں۔ متوسط طریقے سے سیدھے سادے دو ایک کھانے ہونے چاہئیں۔ ولیموں میں زیادہ تعداد دونوں طرف کے رشتہ داروں کی ہو، تھوڑے بہت احباب بھی شامل ہوں، مگر ہدایت نبوؐی کے مطابق ایک تعداد غریب طبقے کے پڑوسیوں کی بھی ہو۔ انہیں بھی عزت و آبرو سے بٹھا کر مناسب انداز سے کھانا کھلایا جائے بلکہ اگر خوش حال لوگوں کے ساتھ ہی انتظام ہو تو ان میں طبقاتی تفاوت کے احساسات کو نشوونما نہیں ملے گی۔

آج کل تو ایسے ایسے ولیموں کا انتظام ہوتا ہے جیسے دَورِ عباسی میں ملکۂ خیزران کی شادی کا اہتمام ہو رہا ہو۔

خدا کے بندو! بندگی و مسکینی کی سطح پہ اپنے آپ کو لاؤ۔ اور شادی کے ہر مرحلے کو نمائشِ دولت کا ذریعہ نہ بناؤ۔

جسے خدا نے ضروریات سے زائد دولت دی ہے وہ اس میں شادی بیاہ کے موقع پہ زیادہ سے زیادہ حصہ غلبۂ اسلام، تبلیغ دین، تعلیم قرآن، یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی بہبود اور مریضان دق و جذام کے علاج کے لیے صرف کر کے ایک مثال قائم کرے۔ اور نہیں تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ شادی

کہ فریقین اپنے اپنے خرچ کا پانچواں یا دسواں حصہ انفاق فی سبیل اللہ کے لیے متعین کر دیں۔

آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ تحائف اور سلامیوں کا سلسلہ بھی اب جملہ حدود کو پھلانگتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اندرونِ خانہ کے محدود حلقۂ اعزہ کے سوا سب کو اس طرح کی تکلیف سے روک دیا جائے۔ ایک تو لوگ شرکت کے لیے وقت اور مصروفیات کی قربانی دیں، اوپر سے تحائف کا انتظام بھی کریں اور اس میں بھی اظہارِ قرابت و خلوص کا مقابلہ کہ کیا چیز دوسروں سے بڑھ کے نادر محسوس ہو۔

اس طرح سلامیوں کا سلسلہ اب پچاس اور سو روپے کی حدوں سے بھی تجاوز کر کے پانچ پانچ سو روپے تک پہنچ گیا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی میرے علم میں آئیں کہ لاکھ روپیہ تک سلامی میں ایک پارٹی رکھتی ہے۔

سلامیاں وغیرہ بھی قریبی گھریلو رشتہ داروں میں اعتدال سے چلیں اور اگر کسی کو دس یا پانچ روپے کی توفیق ہو تو اُس کی طرف سے اسی کو علامتِ خلوص سمجھا جائے۔

شادی ہو چکنے کے بعد ازدواجی زندگی کی خوبصورت اُٹھان ہی وہ اصل چیز ہے جس پر توجہ دی جانی چاہیے۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو جادۂ حیات کی ہم سفر اور رفیقِ منزل سمجھے، نہ یہ کہ ایک خادمہ یا لونڈی حاصل ہو گئی ہے۔ جس کی نسائی فطرت کی وجہ سے اسے ہر وقت غیظ و غضب، طعن و طنز اور بداعتمادی اور سوئے ظن کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عورتیں مردوں کے پاس خدا کی طرف سے ایک امانت ہیں۔ ان کے ساتھ بلا وجہ بدسلوکی اور بدگوئی کا رویہ کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ ذمہ داری بھی مرد ہی کی ہے کہ وہ اپنی ماں بہنوں کے احترام اور بیوی کی محبت کے حدود قائم رکھے اور کسی ایک طرف جھک کر انتہا پسندی اختیار نہ کرے۔ جو بیوی کے حقوق و معاملات ہیں ان میں حصہ کے دوسرے لوگوں کا کوئی دخل نہیں، جو ماں بہنوں کے حقوق ہیں اُن میں بیوی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اب یہ مرد کا اپنا کام ہے کہ الگ رہن سہن اگر میسر نہ ہو تو عدل کی تلوار کی دھار پہ اس توازن سے چلے کہ معاملے کو کسی طرف سے بگڑنے نہ دے۔ جہاں کہیں بیوی و شوہر دونوں کی طرف سے محبت اور

اعتماد اور تحفظ حاصل رہتا ہے۔ وہاں ملے جُلے گھروں میں کچھ زیادہ خرابی نہیں ہوتی۔ بصورتِ دیگر گھر پہ سالوں سے چھائی ہوئی دو تین عورتیں جب ایک نئی عورت کو اس دائرے میں داخل ہوتا دیکھتی ہیں تو بالعموم اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہیں، جب کہ شوہر صاحب یک طرفہ سماعت رکھتے ہوں۔ ایسے گھوگھو ٹائپ شوہر ساری ساری زندگیاں اپنے گھر کو امن و سکون سے محروم کر کے گذار دیتے ہیں۔ نہ خود آرام سے رہتے ہیں، نہ بیوی کے لیے چین اور نہ بچوں کے لیے سکون۔ محض دل کے یک گونہ خوف سے پیدا شدہ ایک مبہم احساس کے مہیب سایوں کو اپنے اوپر اور گھر کے اوپر مسلط رکھتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو یہ حکمت معلوم نہیں کہ شوہر ایک مدت میں بیوی کو گھر کے لیے تیار کرتا ہے اور بیوی کچھ عرصے میں اپنا شوہر تراشتی ہے۔ بعض رویے دوسرے فریق کے لیے چھوڑنے پڑتے ہیں اور بعض انداز اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کام گھریلو مارشل لا سے نہیں محبت و اعتماد سے انجام پاتا ہے۔

یوں تو اب مشترک خاندانی نظام آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ مگر جہاں باقی ہے وہاں لوگوں کو چاہیے کہ اپنی پرانی روش کو بدلیں اور نئی آنے والی خاتون کو کھلے دل سے خوش آمدید کہیں اور اُسے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون دیں اور اس میں اعتماد پیدا کریں ورنہ اگر ہر وقت ٹیڑھی باتیں کی جانے لگیں تو اس دور کی حساس لڑکیوں کو اُس طرح اندھے صبر کے کولہو میں نہیں پیلا جا سکتا۔ جیسے پہلے ہوتا تھا۔ نہ اب زمانہ وہ رہا ہے کہ شادی سے پہلے جن دو گھروں میں محبت تھی، شادی کے فوراً بعد ان دونوں میں محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔

شادی کی تجویز کرنے سے پہلے گھر کے نئے نقشے کے متعلق ہونے والے شوہر صاحب بھی اور ان کے والدین اور بھائی بہنیں بھی اچھی طرح سوچ لیں۔

یہ ہے اصلاحات کا خاکہ جو میرے ذہن میں ہے۔

جیسا کہ اوپر میں نے کہیں لکھا ہے کہ بعض خدا پرست اور تحریک اسلامی کے فدائی اور کارکن زندگی کے معاملات میں غلط طریقے اختیار کرتے ہوئے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ بیوی نہیں مانتی، بچے ساتھ نہیں دیتے، برادری اتفاق نہیں کرتی۔

اس بارے میں میں اپنے خیالات کا اظہار آئندہ کسی موقع پر کروں گا۔